دوسرا شخص جو ہسپتال میں موجود تھا۔ وہ یہی نوجوان یونس بٹ تھا۔ جس وقت میرے بازو میں صائل کے خون کا قطرہ قطرہ جا رہا تھا، یہ بڑی لجاجت سے داخل ہوا۔

''آؤ بھئی آؤ تم کہاں؟''

وہ بلا جھجک بولا..... ''ڈاکٹر حی کے پاس گیا تھا خاں صاحب۔ میرا خون بھی بی پوزیٹو ہے۔ میں خون دینا چاہتا ہوں لیکن ڈاکٹر حی کہتے ہیں آپ کی اجازت کے بغیر یہ کام نہیں ہو سکتا۔''

''او یار یونس! بیٹھو بیٹھو تم کس مصیبت میں پڑ گئے ہو۔ لہو کی کمی ہو جائے گی خوامخواہ۔ جانے دو۔''

''جی نہیں۔ اشفاق صاحب! مجھے خون دینے دیں۔ میں شیخی مار سکوں گا کہ بانو قدسیہ ''راجہ گدھ'' کی مصنفہ کی رگوں میں میرا لہو دوڑتا پھرتا ہے۔ آپ مجھے اس اعزاز سے کیوں محروم کرتے ہیں؟''

اس کی خواہش میں کچھ ایسی سچائی اور طلب تھی کہ خاں صاحب انکار نہ کر پائے اور یونس کا لہو میری رگوں میں دوڑنے پھرنے لگا۔

باقی دعا ہے کہ اللہ اسے اپنی آرزوؤں میں کامیاب کرے اور لوگ تادیر اسے یاد رکھیں۔ عموماً مزاح نگار سوڈے کی بوتل کی مثل ہوتے ہیں۔ جونہی کسی کی ٹینشن رفع ہو جاتی ہے، گیس نکل جاتی ہے۔ مزاح نگار بھی بھول جاتے ہیں۔ مسکراہٹ اور آنسو میں یہی فرق ہے۔ ایک آنسو بھی یاد میں تادیر باقی رہتا ہے اور گھنٹہ بھر ہنسانے والا لمحوں میں بھلا دیا جاتا ہے۔

ایکٹروں کی دنیا

اللہ نے کچھ بیکار پیدا نہیں کیا۔ لطافت اور کثافت اپنے اپنے مقام پر ہوں تو فائدہ اور راحت پہنچاتے ہیں۔ بے وقت اور غلط مقام پر ان کے نتائج نہیں نکلتے۔ ایسے ہی وفاداری بے وفائی دونوں اپنے اپنے مقام پر خوب ہیں۔ آپ سمجھیے کہ گھنا چھتنار درخت ایک مدت ایک ہی جگہ کھڑا رہتا ہے۔ اس کی وفاداری آپ کے سامنے ہے۔ پرندے گھونسلے بنانے، مسافر آرام کرنے، لڑکیاں جھولنے ڈالنے کے لیے ایسا ہی سایہ دار شجر تلاش کرتی ہیں۔

بہار کے دنوں میں کھلنے والے خوشبودار پھول دو روزہ مہمان بڑی بے وفائی کے مرتکب ہوتے ہیں، لیکن ان کے بغیر زندگی کا گلزار رنگ و بو سے آشنا نہیں ہوتا۔ ایسے ہی الیکٹرونک میڈیا سے وابستہ فنکاروں کی بے وفائی ہے۔ پرنٹ میڈیا میں ان کے سکینڈل ان کی بے وفائیاں چسکے لے لے کر بیان کی جاتی ہیں۔ مارلین منرو ہو، ریما ہو، سب اپنے اپنے مقام پر اپنی جان پر کھیل کر آپ کی بے رنگ و بو زندگی میں رنگینیاں لے کر آتے ہیں۔ نہیں معلوم نہیں ہوتا کہ ان کی شہرت کا گلاب کتنی دیر کھلے گا اور کس وقت کوئی نیا چہرہ انہیں پچھاڑ کر گمنامی کے کنوئیں میں پھینک دے گا۔

ہم فقط ان کو دل لگی کا درجہ دیتے ہیں۔ عارضی وقت کی کا ذریعہ سمجھتے اور اپنے اخلاق اور کردار کو ان سے بچا کر ایک قسم کے احساسِ برتری میں چلے جاتے ہیں لیکن 1970ء کے لگ بھگ نہ معاشرہ اتنا بے رحم تھا نہ ناظرین اتنے

خود غرض۔ ٹیلی ویژن کی نئی کھیپ سر اٹھا رہی تھی۔ جب خاں صاحب نے ''ایک محبت سو ڈرامے'' شروع کیے تو کئی من موہنے چہرے اور بڑے آرٹسٹ ان کے قریب آ گئے۔

حبیب، فردوس، جمال، قوی، عابد علی، خیام، افضال، آفتاب احمد سب نہ صرف بڑے نام تھے۔ بڑے لوگ بھی تھے۔

عظمیٰ گیلانی، روحی بانو، خورشید شاہد، منور توفیق اسی عہد کی یادگاریں ہیں۔

الیکٹرونک میڈیا ابھی یوجا پاٹ جیسی متبرک چیز تھی۔

اس میڈیا کو ابھی سٹارٹ ہونے میں دیر تھی۔ ہم لوگ 75۔ جی میں رہتے تھے۔ پتہ نہیں خاں صاحب کو کیا سوجھ کر ''دھوپ سائے'' فلم بنانے کی سوجھی۔ اس کا یونٹ خود ایک معرکے کی چیز تھا۔ فلم کی ریکارڈنگ خواجہ جی نے کی۔ فوٹوگرافر فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن کسی نے بھی خاں صاحب سے ایک پیسے کی ڈیمانڈ نہ کی۔ گانے منیر نیازی نے لکھے اور ان کی دھنیں طفیل نیازی نے کمپوز کیں۔ منیر بھائی کی ایک نغمیہ نظم آج بھی بہت شہرت کی حامل ہے جس کا مکھڑا تھا

شام شہر ہول میں شمعیں جلا دیتا ہے تو
یاد آ کر اس نگر میں حوصلہ دیتا ہے تو

سیٹ کے طور پر ایک پرانی کٹڑی کو معمولی سے کرائے پر لیا گیا۔ خاں صاحب دفتر سے گھر آتے۔ پھر مجھے اور بچوں کو کار میں لوڈ کرتے اور کٹڑی پہنچتے۔ میں حیران تھی کہ وہ ہمیں کیوں ساتھ لے جاتے ہیں۔ ایک روز خود ہی کہنے لگے۔

''کبھی کبھی اردو بورڈ میں کام زیادہ ہوتا ہے۔ شوٹنگ رک نہیں سکتی۔ میری جگہ تم ڈائریکٹ کر لیا کرو۔''

''دھوپ سائے'' کی مختصر کہانی یہ تھی کہ کٹڑی میں سوسائٹی کے راندہ درگاہ لوگ رہتے تھے۔ ان میں ایک طوائف اور ایک شرابی تھا۔ تائب طوائف (منور توفیق) بچوں کو قرآن پاک پڑھایا کرتی تھی۔ اسی کٹڑی میں ایک بدکار دو نمبری مصنوعی دوائیاں بیچنے والے (آفتاب) کا دفتر تھا۔

بچوں کی نفری جب پوری نہ ہوتی تو میرے تینوں بچے اور ان کے دوست عدنان قدیر سے گنتی پوری کر لی جاتی۔

جس روز منور بچوں کے ساتھ ایک بھاری درخت کے تلے ایک تھڑے پر بیٹھی تھی، شرابی (قوی) گا رہا تھا ''شام شہر ہول'' سارا ہنگامہ ہوا۔ مصنوعی ادویات بنانے والے (آفتاب) نے طوائف کی بے عزتی کی اور شرابی (قوی) طوائف کو لے کر رخصت ہو گیا۔ یہاں ایک معرکے کا جملہ تھا جب قوی کہتا ہے:

''چل آپا زہرہ۔ ہم اس کٹڑی میں رہنے کے قابل نہیں ہیں۔''

خاں صاحب کی جملہ تحریروں میں ایک بات انتباہ کے ساتھ جاری وساری ہے۔ وہ بار بار پاکستانی معاشرے کو Warn کرتے تھے کہ دوسروں سے نفرت پاکستانی معاشرے کو کھوکھلا کر کے اسے طبقوں میں بانٹ دے گی۔ پھر اس میں یکجہتی اور قومی مفاد کی پنیری لگانا مشکل ہو گی۔ جیو اور جینے دو کے فارمولے پر عمل کر کے ہی بھانت بھانت کے لوگ اکٹھے رہ سکتے ہیں اور ایک منزل کے راہی بن سکتے ہیں۔

اسی فلم میں ایک بدنصیب لڑکی کے منہ سے خاں صاحب نے ایک ایسا جملہ کہلوایا جو بعد میں کئی مقامات پر انھوں نے خاص طور پر استعمال کیا۔ یہ بدنصیب لڑکی جو شرابی سے محبت کرتی ہے، تندور چلاتی ہے اور آرزو رکھتی ہے کہ شرابی شراب پینا چھوڑ دے۔ جب شرابی کٹڑی سے رخصت ہو جاتا ہے تو کہتی ہے۔

''پہلے میں کہتی تھی کہ وہ پینا چھوڑ دے۔ اب میں کہتی ہوں وہ چاہے پیتا رہے لیکن یہیں رہے۔''

کچھ دیر بعد اپنے آپ کو سمجھانے کے انداز میں دل سوزی ہوئی کہتی ہے:

''جانے والے چلے جاتے ہیں لیکن اپنی محبت یہیں کہیں چھوڑ جاتے ہیں۔''

یہ جملہ اب مجھ پر صادق آتا ہے۔ خاں صاحب تو چلے گئے لیکن اپنی محبت یہیں کہیں آپ لوگوں کے دلوں میں چھوڑ گئے ہیں جس کی بدولت زندگی قابلِ برداشت ہے۔

یہاں سے قوی، خاں صاحب کا ہم سفر بن گیا۔ قوی اور اس کی اہلیہ ناہید ابھی تک مجھے بڑی محبت سے ملتے رہتے ہیں اور ان کی محبت کا مجھے بڑا سہارا ہے۔ قوی چونکہ پٹھان آدمی ہے اس لیے اس کی غیرت وفاداری کی بنیاد میں ہے۔ ابھی تک اس کی نیازمندی میں کمی نہیں آئی۔

''دھوپ سائے'' سینما گھر میں ایک ہفتہ بھی نہ چلی، لیکن خاں صاحب اور میرے درمیان کبھی کوئی ایسی بات نہ ہوئی جس سے مایوسی کی بو آتی ہو۔ خاں صاحب زندگی گزارنے کا طریقہ، سلیقہ اور وطیرہ جانتے تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ شکست آخری حرف نہیں۔ خم ٹھونک کر یا علی کا نعرہ لگا کر چیلنج قبول کرنے سے زندگی کی بازی جیتی جا سکتی ہے۔

خاں صاحب کی زیادہ توجہ جب فلم کے تجربے کے بعد ٹیلی ویژن ڈرامے کی طرف مبذول ہوگئی تو ''ایک محبت سو ڈرامے'' سے کھیل گرم ہوا۔ خاں صاحب پروڈکشن میں تو شامل نہ ہوئے لیکن ڈرامے کی ریڈنگ ضرور کراتے۔ ڈرامے کی کاسٹ ان کے گرد سکرپٹ ہاتھ میں لیے ریہرسل کرتی۔ وہ لب ولہجہ اور تلفظ ٹھیک کراتے۔ خود پڑھ کر سمجھاتے کہ Stress اور Pause کیا معنی رکھتے ہیں۔ جس طرح مکالموں کی ادائیگی میں وقف کی اہمیت ہے۔ کس مقام پر توقف کرنا اہم ہے، ایسے ہی خاں صاحب اپنی ہوسٹ کورکنے، تیز بولنے اور آواز گرا کر یا بلند کرنے کے مقامات سمجھاتے۔ یہ ریڈنگ ایکٹروں میں یگانگت اور مفاہمت کی ایسی فضا قائم کر دیتی کہ مسابقت کی جگہ پر معاونت سے کام سہولت سے ہو جاتا۔

پھر میں نے خاں صاحب کی نقل میں کھیل لکھنے شروع کر دیے۔ میرا ڈرامے سے لگاؤ اس وقت سے تھا جب میں انارکلی ڈرامہ مشکل سے پڑھ سکتی تھی۔ اس ڈرامے سے میرا قلبی لگاؤ 60۔ فیروز پور روڈ پر زندہ تعبیر بن چکا تھا۔ جب اتنا بڑا چانس ملا تو میں نے ٹی وی اور ریڈیو کے لیے ڈرامے لکھنا شروع کیے۔ ''دھوپ جلی'' اور ''خانہ بدوش'' لکھ کر مجھے گیلانی، عابد علی اور حبیب کی شعبدہ بازی دیکھنے کا علم ہوا۔ تب ایکٹر لباس نہیں بدلتے تھے۔ اپنے اندر ایک نئے کردار کو داخل کر کے اس کی طرح سوچنے، عمل کرنے اور اٹھنے بیٹھنے پر ترجیح دیتے تھے۔

میرے ڈرامے ''زرد گلاب'' میں روحی بانو اور عابد علی کے کام کو ابھی بھی لوگ سراہتے ہیں۔ ''رات کے ...'' میں فردوس جمال نے جو معرکہ سر کیا اسے لوگ نہیں بھولے۔ اس کے علاوہ قوی خاں، بندیا، راحت کاظمی، ثروت عتیق ...

ساحرہ کاظمی، طلعت حسین، سکندر شاہین ایک پوری کھیپ ایکٹروں کی ایسی ہے جس کے ناموں سے بھی آج کی پود
نہیں۔

خاں صاحب نے تو ٹیلی ویژن کے لیے اتنے فنکاروں کو روشناس کیا اور خود ان کے ٹیلنٹ سے متاثر ہوئے کہ کتاب میں ان سب کا محاسبہ کرنا ناممکن ہے۔ اس کے لیے تو کسی ایسے ٹی وی کے نامہ نگار کو زحمت کرنا پڑے گی جو ٹیلی ویژن کی تاریخ مرتب کر رہا ہو۔ یہاں تو ''ایک محبت سو ڈرامے'' ''تو تا کہانی'' اور ڈرامے'' ''من چلے کا سودا'' کو بھی زیرِ نظر سے دکھایا نہیں جا سکتا۔ آخر برسوں کا سفر چند صفحوں میں کیونکر قید کیا جا سکتا ہے۔

حنا بابر علی

داستان سرائے کے کالے پھاٹک پر ان دنوں نہ رات کو تالا لگتا تھا نہ دن ہی کو کبھی اسے مقفل کیا جاتا۔ لوگ روک ٹوک اندر چلے آتے اور ہم دونوں اپنی تو یافت شخصی شیخی کے تحت انہیں بڑی خندہ پیشانی سے ملتے۔ اس وہم کا یہ مطلب تھا کہ ہم اپنے اندر بھی اسی طرح کے گھیرے میں تھے کہ ہم کس قدر نیک، اچھے اور مددگار قسم کے بندے ہیں۔

ایک دن ہمارے ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ میں اس وقت جھاڑن ہاتھ میں لے کر صوفے جھاڑنے میں مصروف تھی۔ ایک لڑکی داخل ہوئی۔ اس نے بھڑکتے سرخ رنگ کی پینٹ اور کوٹ پہن رکھا تھا۔ نہ سر پر سکارف تھا نہ گلے میں دوپٹہ۔ ایسی شعلہ رو لڑکیاں تب شاذ ہی ملتی تھیں۔ میں نے اسے صوفے پر بٹھایا اور آنے کی وجہ تسمیہ پوچھی۔

حنا بابر علی نے کہا...... ''Ann Arbor میں پڑھتی ہوں۔''

''وہ کہاں ہے بھئی؟''

''امریکہ کی ایک ریاست Seatle ہے۔ اس میں یہ کالج ہے۔ آپ کو شاید علم نہ ہو لیکن اس کالج میں Co-education نہیں ہے۔''

''اور تم کیا پڑھ رہی ہو؟''

''میں انگریزی میں ایم اے کر رہی ہوں۔''

اس نے میرے سامنے دھرے میز پر ایک کہانی رکھ دی۔ اس کہانی کا نام The Heed Seekers تھا۔

''یہ میرے Thesis کا حصہ ہے۔ میں نے آپ کی کہانی ''توجہ کی طالب'' پڑھی۔ اس کا ترجمہ کیا۔ میرے سپروائزر نے اسے approve کر دیا ہے لیکن جب تک آپ تصدیق نہ کریں گی، یہ آگے بھیجی نہیں جا سکتی۔''

گرمیوں کے دن، جولائی کا مہینہ، یہ اس رابطے کا آغاز تھا جو سیدھی لائن بن کر ہمیں یہاں تک لے آیا ہے۔

اس پینٹ شرٹ میں ملبوس لڑکی میں عجب قسم کی انکساری اور عاجزی تھی۔ وہ جب اس کا جی چاہتا منہ اٹھا کر میرے پاس آ جاتی۔ تب مجھے اس کی فیملی بیک گراؤنڈ کا کچھ علم نہ تھا۔ نہ چھان بین ہی کی عادت میں مبتلا تھی۔ میں نے اس سے کبھی نہ پوچھا کہ وہ کس علاقے میں رہتی ہے۔ اس کا حسب نسب کیا ہے اور اسے مجھ میں ایسا کیا نظر آیا کہ وہ گھر کا فرد ہی بن گئی۔

حنا بابر علی میں ایک خوبی اور بھی انکساری کے علاوہ تھی۔ وہ بہت Helpful تھی۔ کبھی صوفے پر چڑھ کر نہ بیٹھتی کہ اس کی دیکھ بھال اور خدمت کا بوجھ میزبان پر پڑ جائے۔ میں جو کچھ کر رہی ہوتی وہ فوراً یہ کام میرے ہاتھوں سے لے لیتی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ایک روز میں فرش پر ٹاکی پھیر رہی تھی۔ اس نے فوراً گیلی ٹاکی میرے ہاتھ سے لی اور فرش کو آئینہ کر دیا۔

پھر وہ صبح آنے لگی۔ انیس اس وقت یونیورسٹی میں ایم بی اے کر رہا تھا۔ میں اس کا ناشتہ بنانے میں مشغول ہوا کرتی۔ حنا کے آنے پر وہ فوراً انڈے میرے ہاتھ سے لیتی اور ایسا آملیٹ تیار کرتی کہ ہم سب حیران رہ جاتے۔

پھر بسا اوقات وہ دوپہر کے وقت چھوٹی بہن کو اچھی اچھی ترکیبوں سے نئے نئے کھانے پکا کر دکھاتی اور ہم سب اس طرح وہ کھانے کھاتے گویا کسی ریستوران میں بیٹھے ہوں۔ آج تک اس کے گھر سے پکے ہوئے دہی بگھارے بینگن اور ان گنت سوغاتیں آتی رہتی ہیں۔ میں انہیں کبھی نقل کرنے کی کوشش نہیں کرتی کیونکہ مجھے علم ہے یہ سلسلہ جاری ہے، کبھی نوبت شید تک نہیں ہوتی۔

کہانی سے میں تو مطمئن تھی لیکن وہ کبھی ترجمے سے مطمئن نہ ہوئی۔ اسی سلسلے میں اس نے یہ ترجمہ انیق کو دکھایا۔ منظور قادر پھر باقاعدگی سے افسانہ دیکھنے آتے رہے۔ وہ چونکہ سکالر آدمی تھے، اس لیے انہوں نے کئی جگہ ترجمے کو کھاڑ پچھاڑ دیا۔ دوستی کے ان مراحل سے گزرتے بالآخر مجھے علم ہوا کہ حنا بابر علی، سید بابر علی کی بیٹی ہے۔ میں نے بہت مدت بعد پیکیجز کی فیکٹری کا بیرونی حصہ اور اس کے سامنے لگے ہوئے ان گنت ٹرک دیکھے جن پر tle Rose اور Petal اور پیکیجز کی دیگر مصنوعات مارکیٹ کرنے کے لیے بھیجی جاتی ہیں۔ اندر جانے کا اتفاق مجھے صرف ایک بار ہوا جب ... خاں صاحب اور میں بابر علی صاحب کے پاس انیس خاں کی نوکری کے سلسلے میں گئے۔

حنا سے بہت پہلے مجھ سے منو بیگم اور واجد مل چکے تھے۔ منو کا اصل نام سائرہ تھا لیکن مجھے اس پیاری سی لڑکی کا اصلی نام معلوم کرنے کی ضرورت پیش نہ آئی۔ پتہ نہیں واجد کب اور کہاں ملے لیکن رفتہ رفتہ وہ باقاعدگی سے ہمارے ہاں آنے لگے۔

منو عموماً اس کانے گوشے پر بیٹھ جاتی جو اوپر خاں صاحب کی لائبریری کی طرف جاتا تھا۔ واجد خاں صاحب کے ساتھ عموماً باورچی خانے میں بیٹھتا۔ یہ باورچی خانہ نہ جانے کیوں ہمیشہ ہمارے ڈرائنگ روم کا رول ادا کرتا رہا ہے۔

ایک روز وہ اپنے ساتھ ایک لوہے کی کڑاہی مرغی اور کچھ مسالے لے کر آ گیا اور کہنے لگا کہ آج میں آپ کے لیے کڑاہی پکاؤں گا۔ برگر اور پیزا (Pizza) تو دور کی بات ہے ابھی کڑاہی، تکے اور توے کی ٹکیاں چانپیں مڈل کلاس میں عام نہ ہوئی تھیں۔ اب کڑاہی تیار ہوئی۔ نان منگوائے گئے۔ ضیافت کا سا سماں بن گیا۔

بہت بعد میں جب حنا بابر علی مستقل طور پر ہمارے گھر آنے جانے لگی تو مجھے پتہ چلا کہ منو بیگم اور واجد دراصل حنا کے رشتہ دار ہیں اور وہ بھی بہت قریبی یعنی سید بابر علی کے بھائی کی اولاد۔

حنا سے ملنے ملانے کے سلسلے میں میری ملاقاتیں پروین بابر علی سے ہونے لگیں۔ حنا کی والدہ پروین نے مجھے اپنے حسن سے اپنی فراخی اور وسعت قلب سے ہمیشہ disarm کیا۔ وہ بغیر کسی جھجک یا حجاب کے مجھے اپنا ازلی دوست

...گئے گئیں۔ پرائیویٹ خطوط، واقعات، دوستوں کی باتیں، رشتہ داروں کا زائچہ ان ہی سے پتہ چلا۔

حنا کے دادا مراتب علی شاہ تھے جو ایک بڑے ہی سیلف میڈ آدمی تھے۔ انہوں نے سائیکلوں سے اپنا سفر شروع ...کے پیکجز کی بنیاد رکھی تھی۔ ان ہی کی رواداری اور عاجزی کے جرثومے (Genes) ابھی تک خاندان میں چلے آ رہے ...ہیں۔ شالیمار ہسپتال جو غریب لوگوں کا مفت علاج کرتا ہے اور بابر علی ٹرسٹ جو نادار لوگوں کی دادرسی میں ثانی نہیں، اس ...کی یاد زندہ کرتے ہیں جو جاتے وقت اپنی وراثت میں انہیں شامل کر گئے لیکن میں نے کبھی حنا کے لبوں سے نہ تو دادا کا ...افسانہ ان مخیر اداروں ہی کا۔ وہ تو عجب طور پر ادب سے وابستہ تھی اور ادیبوں کی پوجا میں مصروف رہتی تھی۔

مجھ سے بھی زیادہ اس کی وابستگی فیض صاحب سے رہی۔ فیض صاحب نے تو بڑی جانکاری سے فیض صاحب ...کے فیض کو اپنی ذات میں چار چاند لگانے کے لیے استعمال کر لیا لیکن حنا قدرے احمق ہے۔ اس نے میرے سوائے شاید ...تعلق خاطر کا ذکر نہ کیا جو اسے فیض صاحب سے تھا۔

وہ جب امریکہ میں رہتی تھی۔ فیض کچھ دیر کے لیے اس کے پاس ٹھہرے تھے۔ وہ زبانی اسے اپنی نظمیں ...سناتے۔ اس کے پکائے ہوئے کھانے نوشِ جاں فرماتے۔ اس کی اردو کی نظمیں سنتے۔ غرض یہ کہ یہ تعلق ایک عرصہ تک قائم ...رہا لیکن حنا اس تعلق سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکی۔

چلتے چلاتے اور ہوتے ہواتے وہ وقت آ گیا جب پروین کو بیٹی کی گھر بسائی کی فکر صبح و شام ستانے لگی۔ حنا ہر ...معاملے میں سعادت مند تھی، لیکن شادی کے معاملے میں وہ الف ہو جاتی اور کسی رشتے پر رضا مند نہ ہوتی۔ پروین اسے ...سیدوں میں بلکہ بہت قریبی رشتہ داروں میں بیاہنا چاہتی تھی۔ حنا مغربی تعلیم کے زیر اثر ان باتوں کو فروعی اور غیر ضروری ...سمجھتی تھی۔ بیٹی کو منانے کا مرحلہ کافی سنجیدہ شکل اختیار کر چکا تھا۔ ایک روز پروین بابر علی بھاگم بھاگ میرے پاس آئیں۔

''بانو آپا۔ میرے ساتھ گھر چلیے۔''

''کیا مطلب؟ کیوں؟''

''بس جی Now or never۔''

میں نے پروین کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر تشفی آمیز لہجے میں پوچھا۔ ''لیکن ہوا کیا ہے؟''

''آج مجھے فیصل امام کا رشتہ آیا تھا۔ وہ تعلیم یافتہ، شائستہ اور بہت محنتی آدمی ہے۔ پہلے تو حنا انکار کرتی رہی۔ پھر ...پستول لے کر کمرے میں چلی گئی۔ میں کھٹکھٹاتی رہی اور ادھر سے کوئی جواب نہیں آتا؟''

''تم کیا چاہتی ہو؟''

''اس سے اچھا مل نہیں سکتا بانو آپا...... لیکن...... وہ کسی لمحے زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھ سکتی ہے۔ ابھی چلیں ابھی۔''

ہم دونوں اسی وقت تیز رفتار گاڑی میں گھر پہنچے۔

میں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ کوئی جواب نہ آیا۔

میں ذرا سی خوفزدہ ہو گئی۔ ''حنا! میری بات سنو۔ دروازہ مت کھولنا لیکن بات سن لو۔''

مجھے لگا جیسے وہ دروازے کے پاس لگی متوجہ ہے۔

"سنو تم میرے گھر رات دن دوپہر جب بھی آتی ہو میرے دروازے تم پر کبھی بند نہیں ہوئے۔ میں نے [illegible] تمھیں اپنی ادبی اولاد سمجھا ہے۔ اگر آج تم نے میرے لیے دروازہ نہ کھولا تو شاید داستان سرائے کے دروازے تم پر بند ہو جائیں ہمیشہ کے لیے۔"

میں نے پروین کو اشارہ کیا کہ وہ غائب ہو جائیں۔

"آپ کے ساتھ کون ہے؟"

"کوئی نہیں، دروازہ کھولو پلیز۔"

چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ حنا نے دائیں بائیں جھانکا اور پھر مجھے اندر بلا کر دروازہ مقفل کیا۔

پستول لکھنے والی میز پر پڑی تھی۔

"مجھے کہیں بھاؤ گی کہ کھڑے رہنے کا حکم ہے۔"

اس نے جلدی سے ڈیسک کی کرسی باہر نکال دی۔ اب میرے تحمل کا ٹیسٹ تھا۔

"مجھے بتاؤ، کیا تم کس سے شادی کرنا چاہتی ہو؟"

"کوئی خاص چوائس تو نہیں لیکن میں اپنی ماں کی بات ماننا نہیں چاہتی۔"

"یعنی تمھیں فیصل پر اعتراض نہیں۔ اپنی ماں کے انگوٹھے پر غصہ ہے جو تمھیں دبا رہا ہے۔"

"میری ماں ایسی ہی ہے بانو آپا۔"

"سنو حنا! میں نے آج تک تم سے کوئی فرمائش نہیں کی۔ تم مجھے اپنی Foster Mother بھی کہتی [illegible] ایک فیصلہ میری فرمائش پر کر سکتی ہو؟"

اس نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"تم فیصل سے شادی کر لو۔ وہ تعلیم یافتہ، شریف الطبع، اچھے کردار کا مالک ہے۔ اگر کہیں باہر شادی [illegible] بالکل اجنبی لوگوں سے رابطہ کرنا ہوگا۔ شاید وہ تمہاری سگریٹوں کا بوجھ بھی برداشت نہ کر سکیں۔ میری خاطر حنا۔۔۔ [illegible] لیے یہ سہرا میرے سر باندھ دو۔۔۔۔۔ کچھ تو میں پروین کو بھی تحفے میں دے سکوں!"

حنا کی شادی بخیر و عافیت فیصل امام سے ہو گئی۔

فیصل نے شادی کے بعد خانیوال میں مبارک ڈیری کھولی اور مبارک دودھ کو مارکیٹ کرنے لگا۔ کچھ دیر [illegible] اس نے خانیوال کونونٹ میں پڑھانے کی کوشش کی۔ حنا خانیوال چلی گئی اور بڑے سادہ سے گھر میں نہایت معمولی فرنیچر [illegible] ساتھ متاہل زندگی شروع کی۔ آپ کو سن کر تعجب ہوگا کہ ان دو کمروں کے گھر میں اس کے پاس صوفے تک نہ تھے۔ [illegible] نے خالی کھوکھے بچھا کر ان کو تکیوں سے سجا لیا اور کوئی پروا نہ کی۔

لیکن فیصل بنیادی طور پر زمینوں اور سیاست سے وابستہ تھا۔ اس کا دل بزنس کی دلدل میں کبھی نہ پھنس[illegible] دونوں لاہور آ گئے۔ فیصل امام نے کچھ عرصہ اپنے سسر کے کالج Lums میں بھی پڑھانے کی کوشش کی لیکن دل [illegible] میں انکار رہا۔ پروین نے حنا کو ایک بہت خوبصورت عالیشان بنگلہ بنوا دیا۔ فیصل نے لاہور کی بے جان گہما گہمی کا حصہ [illegible]

ش کی لیکن بے سود۔

وہ اپنے گاؤں میں لوٹ گیا جہاں اس کے پیارے مزارعے، مراثی، مٹھی چاپی کرنے والے مالشیے، تندوروں پر روٹیاں پکانے والیاں، اندر باہر آنے جانے والوں کا ایک میلہ تھا۔ وہ ایک طرح سے حنا کا ہر بند بن گیا۔ آیا چند دن رہا اور پھر واپس جہانیاں۔ دونوں نے اس وضع کی شادی سے برضا و رغبت وتہ کرلیا۔

یوں سمجھیے کہ ہر خوبی مکمل طور پر خولی نہیں ہوتی۔ اس میں کہیں نہ کہیں سے خرابی ضرور در آتی ہے اور ہر خرابی میں ضرور ہوتا ہے کہ کہیں اسی کے اندر سے فلاح اور بہتری کے لیے راستہ جاتا ہے۔ حنا نے پیکجز میں نوکری کر لی۔ اب روف رہنے لگی لیکن اس کے ساتھ ساتھ اسے نظمیں لکھنے کا وقت بھی زیادہ ملنے لگا۔

فیصل امام کے بڑے بھائی فخر امام اور عابدہ حسین بڑے فعال سیاستدان ہیں اور عابدہ جسے گھر والے ''چندی'' جے ہیں، نہ صرف چاند صورت ہے لیکن حنا کی طرح کچھ اندر سے بھولی بھولی اور دوسروں پر بھروسہ کرنے والی ہے۔ میں سے دو چار مرتبہ ملی ہوں اور مجھے تعجب رہا ہے کہ سیاست تو ترقی پذیر ممالک میں خرانٹ لوگوں کا پروفیشن ہے، پھر عابدہ ں کہاں؟

فخر امام اور عابدہ کی انتہائی کوشش رہی ہے کہ فیصل ہمہ وقت سیاستدان بن جائے لیکن وہ ابھی زمینوں اور ست میں بٹا ہوا ہے لیکن حنا کو عجیب طرح سے سکون کا خزانہ مل گیا ہے۔

انسان کو غمِ تنہائی بہت کچھ عطا کرتا ہے۔ کچھ لوگ اس غم کو اپنے لیے سونا بنا لیتے ہیں۔ کچھ اس آشوب آگہی کو ب کے حوالے کر کے وقت کو رائیگاں گزار دیتے ہیں۔ حنا ہولے ہولے اس طرف لوٹنے میں مصروف ہو گئی ہے جو ب کو سکون اور اطمینان دیتا ہے۔ ذکر فکر کی دولت سے مالا مال ہو کر اس کی سوچ یکسر بدل گئی۔ پہلے چہرے پر ملال کے ت تھے، ہولے ہولے ان کی جگہ عجب قسم کی روحانی طراوت نظر آنے لگی۔ نظموں کا رخ بھی یکسر بدل گیا۔ اسے نہ ھنے والوں کی اکثریت ڈرا سکتی تھی نہ اس بات کی پرواہ تھی کہ پڑھنے والا اس کی نظموں کو پڑھ کر دل سے لگاتا ہے کہ ی میں پھینک دیتا ہے۔

اس کے میل جول میں بھی فرق آنے لگا۔ وہ جیکن ہاؤس کی انیسہ انجم سے رابطہ بڑھانے لگی جو مغرب میں جا کر ر اور رسول ﷺ کی تعلیمات کے سمپوزیم کر رہی تھی۔ یہاں بھی جب وہ ہوتی تو گپ شپ اور غیبت سے پرہیز کرتی اور ی بندی بن کر زندگی بسر کرتی۔

اب یہاں پہنچ کر ایک اور فیصلہ حنا کو کرنا پڑا۔ اس نے پبلشرز کے پیچھے بھاگنا، ان کی تجویزیں ماننا یکدم ختم کر ور اپنی کتابیں چھپانے کا عزم کر لیا۔ اب پیکجز سے اس کی کتابیں چھپ کر منظرِ عام پر آ رہی ہیں۔ وہ اپنا اردو کلام بھی پنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ اس کی ان نظموں پر اسلم کولسری نظرِ ثانی کر چکے ہیں اور مجھے امید ہے کہ اردو قاری ان نظموں کو ریں گے۔

محترمہ نصرت بی بی

خاں صاحب کے عقیدت مندوں میں محمد یحییٰ خاں کے بعد نصرت بی بی کا نمبر آتا ہے۔

کچھ لوگ ہمت اور وقار کے ساتھ زندگی سے نبرد آزما ہونے کا طریقہ سلیقہ جانتے ہیں۔ وہ زندگی میں ہار نہیں مانتے۔ ایسا ہی گھرانہ نصرت بی بی کا ہے لیکن شروع میں میرا یہ خیال نہ تھا۔ ان دنوں میں اس گھرانے سے واقف نہ تھی۔

ایک درمیانی عمر کی خاتون سر پر سفید دوپٹہ سلیقے سے اوڑھے ڈرائنگ روم میں بیٹھی نظر آتی۔ وہ پیر خانے کے آداب سے بخوبی واقف تھی۔ خاں صاحب کو دل سے اس نے بابا جی سمجھ لیا تھا۔ خاں صاحب ہمیشہ صوفے پر ہوتے نصرت فرش پر ان کے قدموں میں ڈھیری ہوئی لگتی۔ کبھی خاں صاحب کے پاؤں دبا رہی ہوتی۔ کبھی ہاتھ چومتی نظر آتی کبھی آنکھوں سے ان ہاتھوں کو مس کرتی۔ مجھے یہ منظر کبھی سکھ نہ پہنچا سکا۔ میرا خیال تھا کہ خاں صاحب یوں اپنی آ کر شرک اور تکبر کے مرتکب ہوتے ہیں اور پوجا کرنے والے کی انا کو مجروح کرتے ہیں۔ تب مجھے نہ استاد کے مقام تھا جو آپ کو جہالت سے نکالتا ہے نہ ڈیروں کی تربیت ہی کی خبر تھی۔

شاید خاں صاحب سمجھتے تھے کہ تصوف محض اللہ کے حضور عاجزی اور انکساری کا درس سکھانے کا مکتب ہے۔ لوگ مرشد کے حضور اپنا آپ عاجزی اور انکساری سے پیش کر کے ماننے والوں میں داخل ہو جاتے ہیں ان کے کے سامنے اپنا وجود پیش کرنے میں دقت محسوس نہیں ہوتی اور اس طرح وہ شرک اور تکبر جیسے ناقابل معافی گناہوں جاتے ہیں۔

انسان فرد کے طور پر آزادی کا خواہاں ہے لیکن گروہی اعتبار سے نقل کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ گروہ کی تشکیل طور پر ہوتی ہے کہ لوگ معاشرے میں رہ کر وہی رنگ پکڑتے ہیں جو وہ دوسروں میں دیکھتے ہیں۔ ڈیروں کی تعلیم اہم ہے کہ یہاں ماننے والوں کی خصوصی تربیت کی جاتی ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد مجھے علم ہوا کہ دید اور شنید میں بڑا نقص تھا۔ نصرت عقیدت کے جس مقام پر تھی، کوئی مسئلہ نہ تھا۔ نصرت بیگم اپنے خاندان کی بھلائی چاہتی تھی اور اسی لیے وہ دعا کے سلسلے میں محتاج تھی۔

کچھ عرصہ بعد جب نصرت بی بی ریٹائرڈ ہوگئیں تو خاں صاحب نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس رقم سے گھر اور بچوں کو اس پیسے کا علم نہ ہونے دیں کیونکہ بچے اپنی ضرورتوں کا اتنا جال پھیلا دیتے ہیں کہ والدین مجبور ہو جاتے نصرت کے شوہر نے غالباً ساری عمر کچھ اس کی خاطر خواہ کفالت نہ کی تھی۔ وہ اس سلسلے میں مطمئن نہ تھی۔ اس ریٹائر ہوئیں تو انہوں نے بڑی عقلمندی سے خاں صاحب کے مشورے کے مطابق ایک گھر خرید لیا جس میں اپنے بچے بسا لیے۔ بی بی نصرت کے سارے بچے ذہین اور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ ایسے گھرانے میں جہاں ذہانت اچھا کھانا پینا، اوڑھنا بچھونا بڑا اہم ہوتا ہے۔ عین ممکن تھا کہ وہ چودہ پندرہ لاکھ روپیہ ان ہی اللّلوں تللّوں میں نصرت بی بی کو خاں صاحب کے مشورے پر چل کر اچھا راستہ مل گیا اور وہ گھونسلے میں اپنے چگی پوتوں

...کر گئی۔

ہوتے ہوتے نصرت بیگم کے بچے بھی گھر آنے لگے۔ سب سے بڑی بیٹی رابعہ بے حد ذہین اور شدہ آرٹسٹ ہے۔ وہ N.C.A. میں پڑھ بھی رہی تھی اور پارٹ ٹائم کچھ ٹیچنگ بھی کر رہی تھی۔ جب اشرف خاں نے اپنی ایجنسی Advertis... بونا سیر اشروع کی تو اس کے سارے سیٹ رابعہ ہی کے ڈیزائن کیے ہوئے تھے اور دیکھنے والے اس کی اور ... کی تعریف کرتے نہیں تھکتے تھے۔ اس کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اسے خاں صاحب کے دعائیہ سلوگن ''اللہ ... کو آسانیاں عطا کرے اور آسانیاں تقسیم کرنے کا شرف عطا فرمائے'' اس دعا کی اسے بہت خوبصورت تصویر بنا کر ... بنا گھر دی جو دیوار صوفے کے پشت پر تھی۔

رابعہ کا شوہر انجینئر تھا اور خانیوال میں رہتا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ رابعہ خانیوال میں اپنے سسرال میں رہے۔ ... جانتی تھی کہ لاہور میں اس کو ترقی کے مقامات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اشرف نے زیادہ اصرار نہ کیا اور رابعہ کو نصرت بی بی ... نے بیچ لین میں مکان خرید دیا۔ اب رابعہ ہفتہ یا اتوار ملتان چلی جاتی۔ اب رابعہ لندن میں پی ایچ۔ڈی کرنے کا سوچ ... ہے۔ اللہ بہتر کرے۔ اس کی تصویر اب بھی دیوار کی زینت ہے۔ سامنے بیٹھنے والا تو چلا گیا لیکن تصویر ان کی یاد دلاتی ... ہے۔

نصرت بی بی کی منجھلی بیٹی عائشہ سے جب میں ملی، اس کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ اس کی گود میں ایک چھوٹا سا بچہ ... اس کا شوہر ٹھیک ٹھاک حیدرآباد میں رہتا تھا اور اس کی خواہش بھی تھی کہ عائشہ حیدرآباد چل کر بسے لیکن ترقی کرنے ... میں اپنی آزادی کی جو چنگاری سلگتی ہے وہ اسے پابندیوں میں رہنے کا راستہ نہیں دکھاتی۔ بہت منت سماجت کر کے ... سے حیدرآباد بھیجا لیکن کچھ عرصہ بعد وہ اپنے میاں سمیت لاہور آ گئی اور ماں کے ساتھ رہنے لگی لیکن اس کے میاں کو کچھ ... کے مسائل تھے۔ وہ پھر حیدرآباد چلا گیا اور عائشہ واپس میاں کے پاس رہنے لگی۔

خیر گاڑی چلتی ہی رہتی ہے۔ اونچ نیچ زندگی کے رنگ ہیں۔ اپنی اپنی عقل، فیصلے اور تجویز کے مطابق ہر انسان ... کے حل تلاش کرتا ہے اور اسی لیے ندزندگی کی رنگا رنگی میں فرق آتا ہے۔ اللہ کا ارتقائی نظام چلتا رہتا ہے۔

تیسری بیٹی سائرہ مظلوم ہے لیکن مظلوم ہوتے ہوئے بھی وہ ہار ماننے والی نہیں۔ پہلے تو سائرہ نے اپنے آپ کو ... کے بچوں کے لیے وقف کر دیا لیکن اس کے لیے اس قدر ایثار بوجھ بننے لگا۔ آخر اسے اپنے مستقبل کے لیے بھی کچھ ... تھا۔ سائرہ تھوڑی سی موٹی ہے اور اسی موٹاپے کو کم کرنے کے لیے دو اچھرے سے ماڈل ٹاؤن آتی ہے اور وہاں سے ... میرے پاس آ جاتی ہے۔ اس کی شادی ابھی سے بڑا مسئلہ ہے۔ وہ بھی دعا برکت کے لیے یہاں آتی رہتی ہے۔ اسے ... یقین کہ تیر بہدف دعائیں کرنے والا تو کبھی کا رخصت ہو گیا۔

نصرت کے دو بیٹے لندن میں ہیں اور دونوں چھوٹے بھی لندن اڑ جانے کے لیے ''پھرن پھسن'' بیٹھے ہیں۔ ... سبق ان کی زندگی دیکھ کر ضرور حاصل ہوتا ہے کہ زندگی سے ہارتا وہی ہے جو اس کے سامنے ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ وہی ... جیت جاتے ہیں، جو خود اعتمادی اور خوشی سے چلتے ہی چلے جاتے ہیں۔ واہ نصرت بی بی واہ!

چہار درویش

داستان سرائے کے لان میں اُگے ہوئے سندری کے درخت پر بھانت بھانت کے پرندے آ کر بیٹھتے۔ کبھی گھونسلے بناتے اور اپنی اپنی مقررہ رُت میں چلے جاتے۔ گو مفتی جی مجھ سے ہمیشہ ناراض ہوتے تھے کہ تم اتنے چھتنار درخت کہہ کر اس کو بہت زیادہ مان دیتی ہو لیکن یقین جانیے کہ وہ واقعی ایک ایسا شاخوں بھرا درخت تھے جن پر آ کر بیٹھتے، اپنے اپنے حصے کی برکتوں کا چوگا کھاتے اور اڑ جاتے۔ کبھی کبھی ایک کو دوسرے کی خبر نہ ہوتی۔ پھر بھی کچھ والے باہم دوست بن جاتے اور آج ان کے جانے کے بعد بھی ان کا دوستانہ نہیں ٹوٹا۔

مجھے معلوم نہیں کہ چہار درویش علیحدہ علیحدہ اشفاق صاحب سے ملنے آیا کرتے تھے کہ پہلے سے ان کا دو... تھا۔ میں اس طرح کی کنسوئیاں لینے کی عادی نہ تھی۔ گھر کے مددگار لوگوں سے پتہ چلتا کہ چار نوجوان خاں صاحب پاس اندر ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں۔

ایک روز خاں صاحب اندر آئے کہنے لگے۔ ''قدسیہ! اندر کھانا نہ بھجوانا۔ میں درویشوں کے ساتھ ... ہوں۔''

میں نے سوچا لمبی لمبی سفید داڑھیوں والے سروں پر ہیر ٹوپیاں پھنسائے، ٹخنوں سے اونچے چوغے پہنے گے۔ ایک مدت تک میں اسی مغالطے میں رہی، لیکن ان کا عمل بابوں جیسا ہی تھا لیکن حلیہ یہ نہ تھا۔

وہ چاروں جب بھی آتے خاں صاحب کو ساتھ لے کر باہر کسی طعام گاہ میں چلے جاتے۔ سردی کے ... اندرون شہر کے کباب تکے، نسبت روڈ کی ٹکا ٹک چانپیں اور کھیر، حلوے، دہی بھلّے ان کے علاوہ...... تب ابھی ... کا رواج نہ ہوا تھا اور نہ میرا خیال ہے یہ لوگ اسے باقاعدگی سے نوازتے۔

یہ چاروں درویش تعلیم یافتہ تربیت شدہ مڈل کلاس کے لوگ تھے۔ ان کی جیبوں میں دولت تھا ... انہیں کھانے کھلانے کا شوق تھا اور غالباً وہ خاں صاحب کو مسکین جان کر ان کی ادائے عاجزی و انکساری کے ... باہر مدعو کرتے رہتے۔

خاں صاحب کے جانے کے بعد جیسے ان کے بینک اکاؤنٹ مجھے اچانک مل ... ویسے ہی یہ عقیدت ... میسر آ گیا۔ چہار درویش مجھ سے چھتنار درخت کی باتیں کرتے۔ داستان سرائے کی خاموشی، اداسی اور بند ... ذکر کرتے تو دل کا بوجھ بہت ہلکا ہو جاتا۔

خاں صاحب کے وصال کے بعد میں ان سے پہلی بار ملی تو مجھے حیرت ہوئی نہ کسی کے لمبی داڑھی تھی ... اور نہ لمبا چوغہ ہی...... وہ چاروں پروفیسروں کی طرح پینٹ شرٹ پہنتے تھے اور بڑی شستہ زبان بولتے تھے۔ ... کے سردار قدوسی صاحب ہیں۔ میری ایک ہی شرط ہوا کرتی ہے کہ پہلے قدوسی صاحب قدم دھریں اور پھر ... درویش۔

میں ان کے ساتھ خاں صاحب کی طرح باہر تو نہیں جا سکتی لیکن وہ اپنی روایت قائم رکھتے ہیں۔ مجھ ...

ہیں، کبھی بسکٹ کبھی دوسری نعمتیں ان کے ہمراہ ہوتی ہیں۔ میں لاکھ منع کرتی ہوں کہ آپ خاں صاحب کے دھوکے میں مجھے آسمان پر نہ چڑھائیں لیکن وہ پتنگ اڑانے کے شوقین ہیں۔ اڑائے چلے جاتے ہیں۔

وہ پوجا کرنے والے لوگ ہیں۔ انہیں آرتی اتارنے کے لیے بت درکار ہے۔ مجھے "ماں جی ماں جی" کہہ کر مُصر بنے رہتے ہیں۔ برآمدے میں جوتے اتار، دست بستہ میرے سامنے بیٹھتے ہیں۔ انہیں معلوم نہیں کہ عارفِ دنیا سے لئے عقیدت ایک خیالِ خام ہے۔ حسنِ ظن بھی یہاں کچھ کام نہیں آتا!

ارشد مسعود قدوسی

میں (ارشد مسعود قدوسی) 25 اکتوبر 1959ء کو فیصل آباد میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم اور گریجوایشن گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے کی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ بزنس ایڈمنسٹریشن میں داخلہ لیا اور 1983ء میں ایم بی اے (مارکیٹنگ) کیا۔

فیصل آباد اور لاہور کی مختلف پرائیویٹ کمپنیوں میں ملازمت اختیار کی جو تا حال جاری ہے۔ اس دوران اپنے ملک پاکستان کے دوسرے شہروں پشاور، اسلام آباد، راولپنڈی، گجرات، گوجرانوالہ، سیالکوٹ، ساہیوال، ملتان، بہاولپور، حیدرآباد اور کراچی میں رہنے کا موقع ملا اور ایکسپورٹ مارکیٹنگ کے سلسلے میں بیرون ملک سنگاپور، کوریا، ہانگ کانگ، چین کا سفر کرنے کا موقع بھی ملتا رہتا ہے۔ (اللہ کا کرم ہی ہے جس نے مجھے سود کی تعلیم حاصل کرنے اور سودی نظام سے بچائے رکھا۔)

شادی 1988ء میں ہوئی۔ اللہ کے کرم سے تین بیٹے (انس مسعود، معز مسعود، طٰہٰ مسعود) ہوئے۔ انس مسعود اے لیول کر رہا ہے۔ معز مسعود ایس ای کر رہا ہے اور طٰہٰ مسعود حفظ قرآن کے بعد ساتویں کلاس میں ہے۔ ایک اور کرم کہ پچھلے سال میری شریکِ حیات نے عالمہ کا کورس مکمل اور امتحان پاس کر لیا ہے۔

متوسط سے بھی کم درجے کے گھرانے سے پیدل لاہور آنے والے کے پاس اب اپنا گھر اور کار بھی ہے۔ اللہ نے اسی لاہور میں بابا اشفاق، ماں جی بانو قدسیہ اور بابا عرفان الحق ملائے تاکہ عاقبت بھی سنور جائے اور اس بیکراں ذات باری تعالیٰ کے کرم ہی کرم جاری ہیں اور میریاں موجاں ای موجاں۔

محمد عامر (ڈاکٹر)

میں (محمد عامر) لاہور میں پیدا ہوا۔ ابتدائی تعلیم فیصل آباد سے حاصل کی۔ والد مکرم ڈاکٹر محمد ریاض حسین زرعی یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ جنوری 1976ء کو ہمراہ فیملی (والدہ چھوٹی ہمشیرہ اور بھائی) اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ روانہ ہو گئے۔ میں بسلسلہ تعلیم میٹرک میں لاہور آ گیا۔ F.Sc. لاہور سے کی۔

گریجوایشن (B.Sc.) گورنمنٹ کالج فیصل آباد۔ ماسٹر (M.Sc.) زکریا یونیورسٹی ملتان سے کی۔
بعدازاں ماسٹر ڈگری فیڈرل پبلک سروس کمیشن سے گریڈ 17 (Class One Officer) سے ملازمت کا آغاز کیا۔ تاحال دوران ملازمت لاہور، ملتان، اسلام آباد پوسٹنگ رہی۔ اس دوران کچھ عرصہ جاپان بھی قیام رہا، جہاں سے اعلیٰ تعلیمی سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔
2 دسمبر 1993ء لاہور میں شادی ہوئی۔ بیوی راحیلہ عامر مقامی ہسپتال میں ڈاکٹری (M.B.B.S.) کی ملازمت کرتی ہیں۔ ایک بیٹی انعام عائشہ Convent School میں ساتویں جماعت کی طالبہ ہے۔
ڈاکٹر جہانگیر تمیمی (پنجاب یونیورسٹی) نے بابا جی اشفاق صاحب کے پاس بھیجا۔ میری بے چینی کو سکون میسر آ گیا۔ طبیعت ٹھہر گئی اور زندگی بسر کرنے کا ایک نیا رخ متعارف ہوا۔ میں بابا جی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مجھ جیسے بکھرے ہوئے گنہگار اور ادنیٰ حیثیت والے کو اپنے پاس جگہ دی اور بے پناہ شفقت سے نوازا۔

''ماننے کے لیے جاننا ضروری نہیں۔''

''جس نے بندے کا شکر ادا نہیں کیا اس نے خدا کا شکر ادا نہیں کیا۔''

(اشفاق احمد)

عاصم بخاری

نام: عاصم نذیر بخاری
تاریخ پیدائش: یکم مئی 1959ء
آبائی گاؤں: امیر پور سادات ضلع لودھراں
پیشہ: کاروبار
تعلیم: M.B.A.
شادی شدہ: تین بیٹے (سید غیور احمد۔ سید فرقان احمد۔ سید سرمد احمد) ایک بیٹی (سیدہ فاطمہ زہرا)
بڑا بیٹا NUST میں انجینئرنگ کر رہا ہے۔ ایک F.Sc. میں ہے اور دوسرا میٹرک میں۔ بیٹی تیسری کلاس میں ہے۔

بابا کے ساتھ تعلق بہت ہی پرانا۔ سب سے پہلے میں نے انہیں جب میں شاید میٹرک کر رہا تھا، دیکھا اور انہوں نے جواب دیا جو کہ آج تک محفوظ ہے اور پھر یہ تعلق آخری وقت تک قائم رہا اور آج تک یہ تعلق قائم ہے۔ زندگی کے سفر میں تمام تر مطلوب رہنمائی، آج بھی اسی طرح میسر ہے جس طرح ان کی حیات میں میسر تھی۔

پروفیسر محمد اعجاز چوہدری

میں نے 1989ء میں پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ اکنامکس سے ماسٹر ڈگری حاصل کی اور اس وقت لاہور کے ایک کالج میں درس وتدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں اور اب پی ایچ۔ڈی اکنامکس کے سلسلہ میں تحقیقی مقالہ لکھنے میں مصروف ہوں۔

جون 2005ء میں ایک روحانی شخصیت کے حکم سے شادی کے بندھن میں بندھ گیا۔ عالیہ بھی ایک مقامی کالج میں اسلامیات کی لیکچرر ہیں۔ نومبر 2006ء میں اللہ کے فضل سے ایک بیٹا عطا ہوا جس کا نام محمد علی ہے۔

بچپن ہی سے مجھے روحانی شخصیات کا قرب حاصل رہا۔ یہی طبعی رجحان اشفاق صاحب تک لے آیا۔ ان کی محفلوں میں زیر تربیت رہا جس کے سحر سے اب نکلنا مشکل نظر آتا ہے۔ خان صاحب کی تربیت، محبت، شفقت ان کی کبھی یاد سے غافل نہیں ہونے دیتی۔

میں نے خان صاحب کو ''زاویہ'' میں جس زاویہ سے دیکھا وہ مجھے ادبی شخصیت سے زیادہ روحانی طور پر قد آور نظر آئے۔ قاری ان کو ادب میں تلاش کرتا ہے اور میں انہیں روحانیت کے مراتب طے کرتے دیکھتا ہوں۔ دین کو سہل انداز میں پیش کرتے اور عملی زندگیوں میں اس کو لاگو کرتے ہوئے دیکھتا ہوں۔

خان صاحب کی ہمہ جہت شخصیت، محبت، مساوات، ہمدردی، ایثار اور آسانی کا جو عملی درس دیتی ہے، اس کا احساس شدت سے پیدا ہوتا ہے کہ ایسی نابغہ روزگار شخصیت بظاہر تو ہم میں نہیں ہے مگر اس کی گفتگو ہر جگہ سنائی دیتی ہے۔ خان صاحب کا ایک بڑا وصف یہ تھا کہ ہر کوئی خواص ہوں یا عوام ان کو اپنا محسوس کرتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ وہ سب سے زیادہ پیار اسی سے کرتے ہیں جو ان کے سامنے ہوتا ہے۔

ڈاکٹر محمد مسعود قریشی

ریاض محمود کہتے ہیں کہ خان صاحب جانتے تھے کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، اسی لیے ڈاکٹر تاج نے جب فاطمہ میموریل ہسپتال میں ان کا آپریشن کیا تو کچھ کیے بغیر واپس ٹانکے لگا دیئے، لیکن خان صاحب تشویش پھیلانے سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے کبھی نہ بتایا کہ انہیں جگر کا کینسر ہے، جو نا قابل علاج ہے۔

لیکن ابھی جب آپریشن تک نوبت نہیں آئی تھی، وہ ہومیو پیتھک علاج کرتے تھے اور بڑے پُر امید، مثبت رویّے کے ساتھ زندگی بسر کرتے تھے۔ ان ہی دنوں میں ڈاکٹر صاحب اپنی جادو کی پڑیاں لے کر آیا کرتے۔ ان کا کالج علامہ اقبال روڈ کے قریب محمد نگر میں تھا اور خان صاحب ان سے ملنے ان کے کالج جایا کرتے تھے۔

ایک بار ڈاکٹر مسعود کے کالج میں بڑے دھڑلے کا فنکشن ہوا جس میں خان صاحب نے صدارت کی اور مجھ پر اضافی مہربانی کے تحت مجھ سے ان طلباء کو ڈگریاں دلوائیں جو 2000ء میں چار سالہ کورس کے بعد پاس ہوئے تھے۔

اب 2007ء ہے۔ خان صاحب رخصت ہو چکے ہیں، لیکن ڈاکٹر مسعود نے اس گھر کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ ان

کے پوتے ڈاکٹر حامد الیاس مسعود باقاعدگی سے میرا علاج کرتے ہیں۔ میں نے آزمایا ہے کہ جن پر اللہ مہربان ہوتا ہے خلق کو بھی مکمل مہربانی کے روپ میں بھیج دیتا ہے۔

شاید آپ مجھ سے مختلف رائے رکھتے ہوں۔

ڈاکٹر طیب (سروسز ہسپتال)

ہر کام کا آغاز ہمیشہ خاں صاحب کرتے تھے اور پھر اپنے تجربے کو کسی Osmosis کے طریقہ سے مجھ تک منتقل کر دیتے تھے۔ 2000ء کے آغاز میں خاں صاحب بار بار آنکھیں ملنے لگتے۔ کبھی عینک اتار کر ایک طرف دھر دیتے۔ پڑھنا لکھنا موقوف کر دیتے۔ انہوں نے کبھی اپنی تکلیف کی تشہیر تو کی ہی نہیں تھی۔ ایک روز میں نے پوچھا۔

''کیوں خاں صاحب! آنکھ میں کچھ تکلیف ہے کیا؟''

''ہاں قدسیہ! بائیں آنکھ سے دھندلا دھندلا نظر آتا ہے۔''

''گھر بیٹھے بیٹھے کیسے پتہ چلے گا کہ آنکھ کو کیا ہے؟''

''ٹھیک ہو جائے گا۔''

''اتنی خوش فہمی بھی ٹھیک نہیں۔ کل آپ میرے ساتھ سروسز ہسپتال جا رہے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''او بھائی مس قوالی..... یہ تیرا کیا سسٹم ہے۔ اِدھر کا تا اُدھر لے دوڑے۔'' وہ بولے۔

''بس جی میں تو ایسی ہی ہوں۔ خوشی Play خوشی Play نا''

دوسری صبح قریباً دس بجے ہم سروسز ہسپتال پہنچے۔ سکندر جیسا وفادار ڈرائیور ساتھ تھا۔ وہ انکوائری سے پوچھ کر تو پتہ چلا کہ آئی ڈیپارٹمنٹ تیسری منزل پر ہے اور اس کے انچارج ڈاکٹر طیب ہیں۔

ہم دونوں تو تھم تھم کر کے اوپر پہنچے۔ تیسری منزل پر ڈاکٹر طیب موجود تھے۔

صاحب رنگت، درمیانہ قد اور جسیم، دلنشین مسکراہٹ۔ خاں صاحب کو دیکھتے ہی اٹھ کھڑے ہوئے۔

''زہے نصیب، زہے نصیب آئیے۔''

ان کا جونیئر ڈاکٹر ہمیں حیرانی سے دیکھنے لگا۔

ڈاکٹر صاحب نے کسی جونیئر کو خاں صاحب کی طرف متوجہ نہ ہونے دیا اور خود ٹیسٹ لیا۔

''خاں صاحب! بائیں آنکھ فوراً توجہ چاہتی ہے۔ اگر ذرا بھی غفلت کی گئی تو بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔''

''آپ کا کوئی کلینک گلبرگ میں بھی ہے؟'' خاں صاحب نے کہا۔

''ناں ناں اشفاق صاحب آپ نے وہاں نہیں آنا۔ وہاں کے ڈاکٹر طیب کمرشل ہیں۔ وہ ایویں کچھ گڑبڑ کر دیں گے۔ یہیں ہسپتال میں آئیے۔ پھر سچی بات تو یہ ہے کہ سروسز کا Equipment Latest ہے۔ اس میں Risk کم ہے۔''

دوسرے دن ہم پھر ہسپتال گئے۔ اس آپریشن کے دوران انیس بیٹا سائے کی طرح ہمارے ساتھ رہا۔

کامیاب ہوگیا اور ہم دونوں ڈاکٹر صاحب کے انتہائی مشکور لوٹے۔ کچھ دن خاں صاحب نے کالی اندھیریاں آنکھوں پر جمائے رکھیں۔ پھر نئی عینک لگی۔ ان کی طبیعت کا پوچھنے ڈاکٹر صاحب گھر آتے رہے۔

لیکن ڈاکٹر طیب کی اصلی مروت خاں صاحب کے جانے کے بعد کھلی۔

آپ کو میں کئی بار بتا چکی ہوں کہ مجھے خاں صاحب کی نقل کی عادت تھی۔ جو کچھ وہ کرتے مجھ پر لازم ہو جاتا کہ میں بھی کروں۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد میری دونوں آنکھوں میں موتیا اتر آیا۔ میں نے دونوں بچوں کو نہ بتایا اور چوری چھپی سروسز ہسپتال پہنچی۔ وہی تیسری منزل پر تیسرا کمرہ۔ مجھے دیکھ کر ایک جونیئر ڈاکٹر نے میرا معائنہ کرنا چاہا لیکن اچانک کہیں سے ڈاکٹر طیب آ گئے۔ انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے جونیئر ڈاکٹر کو منع کر دیا اور خود معائنہ کرنے مشین کے پیچھے گئے۔

''آپا کیا کیا جائے کہ آنکھیں تو دونوں خراب ہیں لیکن آپریشن باری باری ہوگا۔ لکھنے والے کی نظر کام نہ کرے یہ تو واقعی ظلم ہے لیکن یہی زندگی ہے۔ اس کی کوئی منطق نہیں نہ کسی کو اس کی کل ہی سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آپ بروقت پہنچ جایئے گا۔ میں جو کچھ کر سکوں گا ضرور کروں گا۔''

مقررہ وقت پر انیس اور اثیر میرے ساتھ گئے۔ سب کو سفید کوٹ پہنا دیئے گئے۔ ماسک لگائے گئے۔ مجھے مریض کے بستر پر لٹا دیا گیا اور ڈاکٹر طیب نے بڑی پریت سے کامیاب آپریشن کر دیا۔ کارنیا کا لنز بدل دیا گیا۔ مجھ پر دوائیوں کے علاوہ کوئی بوجھ نہ تھا۔ ان کا خرچ بھی نہ جانے کس بیٹے نے دیا، مجھے علم نہیں۔

بس کیا کیا جائے۔ زندگی کے جھمیلوں نے مجھے فرصت نہ دی کہ میں دوسری آنکھ کا آپریشن کرواؤں۔ مجھے مجبور کرنے کے لیے دونوں بیٹوں نے ایک روز اصرار کیا کہ اب بہت دیر ہوگئی۔ آپ پلیز ہمت کر کے دوسری آنکھ کا آپریشن کروالیں۔ ہو سکتا ہے تاخیر سے کوئی بڑا نقصان نہ ہو جائے۔ انیق چونکہ امریکہ میں تھے، اس لیے وہ فون پر بڑی لجاجت سے مناتے رہے۔

میں ان کی خوشی کی خاطر سروسز گئی۔ پتہ چلا کہ ڈاکٹر طیب ایک عرصہ سے چھٹی پر ہیں۔ ان کے کلینک پہنچی تو کلینک پر تالہ پڑا تھا۔ مجھے فکر لاحق ہوگئی کہ شاید ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں اسی لیے چھٹی پر ہیں۔

گھر ڈھونڈ کر پہنچی تو گھر پر بھی تالہ پڑا تھا۔ ایک مفلوک الحال چوکیدار باہر بیٹھا تھا۔

''بھائی ڈاکٹر صاحب کہاں ہیں؟''

''وہ تو بی بی جی دوبئی چلے گئے۔ یہاں تو نہیں آئے دو مہینے سے۔''

چلیے دوبئی والوں کی قسمت کھلی۔

اب 2007ء ہے۔ دوسری آنکھ کا آپریشن ابھی نہیں ہوا۔ سوچتی ہوں کہ آپریشن کراؤں یا یونہی چھوڑ دوں۔ شاید حسن خاتمہ قریب ہو۔

ڈاکٹر شاہد محمود

ڈاکٹر راشد لطیف کے ہسپتال میں ایک میرے محسن ڈاکٹر شاہد محمود بھی ہیں۔ میں شوگر کے ٹیسٹ لے کر ہسپتال

پہنچی تو مجھے ڈاکٹر راشد لطیف نے شاہد محمود صاحب کی طرف ریفر کر دیا۔

مین ہسپتال سے ذرا پیچھے فرٹیلٹی کے سیکشن سے پہلے جہاں کاریں پارک ہوتی ہیں، ڈاکٹر شاہد محمود کا دفتر ہے۔ کچھ سیڑھیاں اوپر چڑھ کر بائیں ہاتھ ایک بڑا سا ویٹنگ روم ہے۔ میں یہاں پہنچی تو ایک نوجوان ڈاکٹر مجھے ویٹنگ روم میں لے گیا۔ ابھی چند منٹ نہ گزرے تھے کہ ڈاکٹر صاحب خود آئے اور آپا آپا کہہ کر مجھے اپنے آفس میں لے گئے۔ اس آفس کے دو حصے ہیں۔ سامنے وہ حصہ ہے جس میں ڈاکٹر صاحب مریض سے ملتے ہیں۔ دیوار پر ان کی ڈگریاں لٹکی ہوئی ہیں۔ پیچھے ان کا معائنہ کرنے والا چھوٹا سا کمرہ ہے، جس میں بلڈ پریشر جاننے اور دیکھنے کے لیے مریض کے لیے ایک اونچا سا بیڈ ہے۔

میرا ہاتھ پکڑ کر جب وہ اپنے آفس میں پہنچے تو یہاں دو تین مریض بیٹھے ہوئے تھے۔ ان سے ڈاکٹر صاحب نے بڑی لجاجت سے کہا۔ ''معاف کیجیے میرا اصول ہے کہ میں مریض کو باری باری دیکھتا ہوں لیکن اب مجبوری ہے، محترمہ آ گئی ہیں۔''

اس کے بعد وہ مجھے اندر والے کمرے میں لے گئے۔ مریض کا بیڈ اونچا تھا۔ میرا ہاتھ پکڑ کر مجھے اوپر چڑھنے سے نرس کو اشارے سے منع کیا اور خود میرا بلڈ پریشر لیا۔

اب میرا معمول ہے۔ میں دوسرے تیسرے ماہ ان کو ملتی ہوں۔ ان کی مروت میں کوئی کمی نہیں آئی۔ اللہ انہیں خوش رکھے۔

ڈاکٹر احمد خاں

یہ بات کچھ کشف سے تعلق رکھتی ہے اور کچھ ہومیو پیتھک علاج سے۔ جس وقت میری والدہ ملتان میں آف سکول تھیں، ان دنوں وہاں ڈاکٹر احمد خاں بھی ہوتے تھے۔ جب مجھے ٹائیفائیڈ بخار چڑھا تو ڈاکٹر صاحب میرا علاج ہومیو پیتھک قطروں سے کیا کرتے تھے۔

پھر ہم I21۔سی میں آ گئے۔ ہمیں پرانے محسن مددگار بھول گئے۔ ایک روز صبح سویرے گھنٹی بجی۔ برآمدے کے پاس نیچے ڈاکٹر احمد خاں کھڑے تھے۔ میں ہکا بکا رہ گئی۔

''آپ......آپ یہاں ڈاکٹر صاحب!''

''بھائی یہ بتاؤ گھر میں کون بیمار ہے؟''

''آپ کو کیسے پتہ چلا؟''

''رات مجھے خواب میں آپا ذاکرہ نے بتایا کہ میرے گھر جائیے وہاں کوئی بہت بیمار ہے۔''

''اندر تو آئیے۔''

''میرے پاس وقت نہیں ہے۔ مریض چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''میں ڈاکٹر ہوں۔شاید کچھ میں مدد کر سکوں۔''

''ضرور آ جائیے۔''

وہ اپنا ڈاکٹری بیگ اٹھائے برآمدے میں چلنے لگے۔

''میرا ایک اور بھی تعارف ہے۔''

''جی فرمائیے۔''

''آپ کے مرزا عبدالرزاق کا میں بھتیجا ہوں۔''

لیجیے خیال حقیقت میں بدل گیا۔ ڈاکٹر عاطف سے اب ملنا کسی تکلف کا حامل نہ تھا۔ میں انہیں کسی فارمیلٹی کے بغیر خاں صاحب کے بیڈروم میں لے گئی۔

خاں صاحب، عاطف کو دیکھ کر نہال ہو گئے۔

''قدسیہ! عاطف کو قہوہ پلاؤ۔ یہ گھرانہ تو کھانے پینے کا شوقین ہے۔''

لیجیے پہلی ہی ملاقات میں عاطف اور خاں صاحب کی دوستی ہو گئی۔ پتہ چلا وہ پروفیشنل آدمی ضرور ہیں مگر دنیاوی ترقی کے ساتھ ساتھ وہ شریعت کے پابند اور روحانیت کے قائل بھی ہیں۔

کچھ عرصے کے بعد پتہ چلا کہ عاطف کی بیگم صاحبہ بھی ڈاکٹر ہیں اور اندرونِ شہر کسی کلینک پر کام کرتی ہیں۔ مجھے یہ انفرمیشن تازہ تھی کہ مجھے علم ہوا کہ بیگم عاطف مرزا نے کرشن نگر کا کلینک چھوڑ دیا ہے اور فرحت ہاشمی کی پیروکار بن گئی ہیں۔ حجاب اوڑھ لیا اور اب وہ ایک ایسا مکتب چلاتی ہیں جس میں گھریلو پردہ دار عورتوں کو فرحت ہاشمی کی تعلیم عنایت کرتی ہیں۔

زندگی عجب طور پر چلتی ہے۔ جو شخص ہر وقت خاں صاحب کے پاس آ جاتا تھا اور میری تشفی کا باعث تھا

7 ستمبر کو جب خاں صاحب اس دنیا سے جانے والے تھے، میں نے قریباً آٹھ بجے صبح عاطف کو فون کیا۔

''عاطف..... ڈاکٹر صاحب! خاں صاحب کی طبیعت ذرا زیادہ خراب ہے۔ آپ پلیز آ جائیں۔ مجھے ... آ رہی، میں کیا کروں؟''

''میں ضرور آ جاتا لیکن میں تو ایئرپورٹ جا رہا ہوں اور بالکل ایئرپورٹ سے قریب ہوں۔''

خاں صاحب کے جانے کے بعد میں ان کی بیگم سے ملی۔ جس طرح کی عورت ان کے ساتھ بجتی ویسی ہی تھی۔

جب عاطف مرزا کے والد فوت ہوئے۔ ان کے قل کی اطلاع ملی۔ میں ان کے گھر گئی۔ میں نے ان کو نئے روپ میں دیکھا۔ وہ بڑی اعجازی اور انکساری کے ساتھ شرعی انداز میں مہمانوں کی دیکھ بھال کرنے میں مشغول تھے۔

اب میری بیماری کا دور دورہ ہے۔ ڈاکٹر عاطف مرزا بڑے تواتر کے ساتھ اسی پرانے انداز میں بیگ اٹھائے آتے ہیں۔ جہاں بٹھاؤ بیٹھ جاتے ہیں۔ میرے نسخے دیکھ کر دواؤں میں اضافہ بھی کر دیتے ہیں۔ دو تین مرتبہ ... ساتھ لائے ہیں، لیکن عاطف مرزا ان لوگوں میں سے نہیں جو واقفیت کو بے تکلفی کا بہانہ بنا لیں۔ بہت جی چاہتا ہے کہ ان کے لیے کچھ مثبت کروں لیکن انسان اپنی خواہش کو ہمیشہ پورا بھی تو نہیں کر پاتا۔

ڈاکٹر اکرم زبیر

کچھ لوگ خوش نصیب ایسے ہیں جو بیمار پڑتے ہیں تو ڈاکٹر آگے بڑھ کر مسیحا کا روپ دھار لیتے ہیں اور کچھ بدنصیب ڈاکٹروں کو چنگل سمجھتے ہیں۔ کچھ کو غلط Anesthesia کا ٹیکہ لگ جاتا ہے اور مریض آپریشن تھیٹر میں ہی دم توڑ دیتا ہے۔ کبھی غلط آپریشن، کبھی پیرامیڈیکل سٹاف کی غفلت..... یہ سب یقیناً ہم سب کے ساتھ ہے۔ کچھ ڈاکٹروں پر تجربے کرتے ہیں۔ انہیں رسوا کرنے میں وقت گزارتے ہیں۔

کچھ حضرات کو ڈاکٹر ملتے ہی گھر والے بھی بھول بھال جاتے ہیں۔ یقیناً اس میں کچھ تو امیر غریب کا چکر بھی ہے سوسائٹی کے وی آئی پی کو اور طرح کا رویہ ملتا ہے اور کچھ بے نوا روتے پیٹتے ہسپتالوں سے رخصت ہوتے ہیں اور بسا اوقات قرض کی لعنت میں بھی پھنس جاتے ہیں، لیکن اس ساری اونچ نیچ میں ایک فیکٹر غریبی بھی ہے۔ جہاں امداد غیبی اور اللہ کی رحمت آ پہنچتی ہے وہاں سارا تفرقہ مٹ جاتا ہے اور کسی کسی بے نوا کو وی آئی پی کا سلوک مل جاتا ہے اور کئی مرتبہ بیچارہ وی آئی پی ہسپتال ہی بدنتارہ جاتا ہے۔ کبھی لندن، کبھی امریکہ، کبھی یورپ۔

میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے رنگ رنگ کی بیماری نے گھیرا لیکن مجھ پر ڈاکٹر صاحبان ہمیشہ مہربان رہے۔ جب میں بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو ہماری کسی سے میو ہسپتال میں جان پہچان نہ تھی۔ مجھے ہر روز ایک بوتل خون کی لگتی تھی لیکن دوسری صبح بلڈ کاؤنٹ پھر گر کر خطرے کی گھنٹی بجانے لگتا تھا۔

ان دنوں صبح عین نو بجے ڈاکٹر اکرم زبیر ہولے سے میرا دروازہ کھٹکھٹاتے اور چپ چاپ پلنگ کے ساتھ لگی کرسی پر بیٹھ جاتے۔ عموماً دن کے وقت اثیر خاں یا انیق میرے پاس ہوتے۔ رات کو خاں صاحب خود میرے پاس گزارتے۔ ڈاکٹر زبیر ہارٹ سپیشلسٹ تھے۔ ان کا کینسر سے کوئی تعلق نہ تھا لیکن ان کی باقاعدگی میں کوئی فرق نہ آیا۔

جب مشتاق یوسفی صاحب کی مہربانی سے یہ طے ہوا کہ ہم لندن چلے جائیں گے اور میں گھر آ گئی تو ڈاکٹر زبیر میری طبیعت کا پوچھنے داستان سرائے آتے رہے اور جب خاں صاحب دل کے مریض ہو گئے تو ہم ڈاکٹر زبیر کے کلینک پر باقاعدگی سے جاتے۔ ڈاکٹر زبیر کو اطلاع ملتی تو وہ فوراً ہمیں اپنے آفس میں بلاتے، بڑی توجہ سے خاں صاحب کو چیک کرتے اور سسٹر سے کہتے ''ان کا ای سی جی میں خود کروں گا۔''

ڈاکٹر اکرم زبیر اتنے چپ چاپ آدمی تھے کہ شبہ ہوتا کہ گونگے ہیں۔ پر ان کے چہرے کی ملائمت بتاتی رہتی کہ وہ پوری توجہ سے سن رہے ہیں۔ پھر نہ جانے کیسے ان کی بیگم میری گرویدہ ہو گئی۔ خاں صاحب کے جانے کے بعد وہ بڑی محبت سے مجھے ملنے آتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب تو مجھے حیران کرنے کو کافی تھے لیکن ان کی بیگم کی محبت نے تو واقعی میرے ہاتھوں کے طوطے اڑا دیئے۔

ڈاکٹر جاوید شیخ

مجھے معلوم نہیں ڈاکٹر جاوید شیخ کب خاں صاحب سے ملے، کب ان سے متعارف ہوئے اور ان دونوں کے

مابین محبت کا کیا رشتہ تھا لیکن جب میں بلڈ کینسر کے مرض میں مبتلا ہو کر میو ہسپتال پہنچی تو خاں صاحب کو مشتاق احمد یوسفی نے فون کر کے کہا ''اشفاق صاحب میں B.C.C.I. بینک کی طرف سے بول رہا ہوں۔ یہاں کے چیئرمین برنی صاحب آپ سے کہہ رہے ہیں کہ آپ بانو قدسیہ کو اپنی ملکیت نہ سمجھیں۔ وہ قومی سرمایہ ہیں۔ ہم یہاں لندن میں ان کا علاج کسی ہسپتال میں کرائیں گے۔ یہاں ڈاکٹر شارپ ایک بہت ماہر ڈاکٹر ہیں۔ وہ ہی ان کے بلڈ ٹسٹ لیں گے۔ آپ میو ہسپتال کی رپورٹ ساتھ لے کر آئیں۔ آپ کو نہ قیام نہ طعام کسی قسم کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔''

یہ تو ایک دوسری کہانی ہے لیکن سفر سے پہلے پڑاؤ پر لندن ایئرپورٹ پر ہمیں جو شخص دوسری مرتبہ ملے وہ جاوید تھے۔ پہلی بار تو ہم یوسفی صاحب کے مہمان تھے لیکن اس دوسری بار ہمارے میزبان ڈاکٹر صاحب نکلے۔ وہ اپنی نئی مرسیڈیز لے کر موجود تھے۔ ہم ان کے ساتھ گھر پہنچے۔ لندن کی بھیڑ بھاڑ سے دور ڈاکٹر جاوید کا گھر تھا۔ باغوں سے گھرا خاموشی کی ردا اوڑھے۔ انہوں نے ہمیں اوپر والی منزل میں کمرہ دیا جس کے ساتھ ایک چھوٹا سا سٹنگ روم بھی تھا۔

ان کی دوسری بیگم حسینہ قریب ہی کاؤنٹی کے ہسپتال میں کام کرتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی چھ سالہ بچی فاطمہ گھر پر موجود ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب لندن کے کسی ہسپتال میں کام کرتے تھے۔ ان دونوں کا معمول تھا کہ باری باری ایک جنا گھر پر فاطمہ کے پاس رہتا اور ایک بندہ ہسپتال میں مریضوں کو دیکھتا لیکن جونہی ہم گھر کا فرد بنے فاطمہ نے ہمیں دادا، دادی کا روپ بخش دیا۔ ہم بھی اس میں خوب مصروف رہے اور نئی جگہ کی اجنبیت ہمیں محسوس نہ ہوتی۔ ہسپتال کے چکر بھی دیتے۔ ڈاکٹر شارپ کے پاس بھی وہی ڈیوٹی دیتے۔ اتنی اپنائیت سے انہوں نے ہماری دعوت کی جس میں لندن کے ادیبوں کو اکٹھا کیا۔ اگر ڈاکٹر جاوید نہ ہوتے تو یہ ملاقات ممکن نہ ہوتی۔

اب 2007ء میں جب وہ مجھے ملنے آئے تو فاطمہ کو دیکھ کر مجھے بڑا تعجب ہوا۔ اتنا وقت کتنی جلدی گزر گیا۔ یہ عجیب رابطہ تھا کہ اس پر اجنبیت کی ذرہ بھر دھول نہ گری!

ڈاکٹر راشد لطیف

جب میں لندن سے واپس لوٹی اور ڈاکٹر شارپ نے یہ طے کر دیا کہ مجھے بلڈ لوکیمیا ہے اور لاہور کے ڈاکٹروں کی تشخیص درست ہے تو معلوم نہیں کیسے ڈاکٹر راشد لطیف کو پتہ چل گیا۔ وہ خاں صاحب کو بہت پہلے سے جانتے تھے۔ وہ ازخود ملے اور تفتیش کی کہ بلڈ کینسر کسی طور پر لہو سے نکلنے والی بیماری نہیں اور میں فوراً راشد لطیف ہسپتال پہنچوں۔ یہاں جب ہم دونوں پہنچے تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ انہوں نے ٹیسٹ لیے اور پتہ چلا کہ کینسر چوری چوری Bones میں جا بیٹھا ہے۔ اب Lis tacteoy کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔

مقررہ وقت پر خاں صاحب، ثویلہ اور میں راشد ہسپتال پہنچے۔ مجھے تیار کر کے جب اندر لے گئے تو ثویلہ کو بھی ماسک اور کوٹ پہنا کر ساتھ لے گئے۔ اتنے بڑے آپریشن کا ڈاکٹر صاحب کم از کم ڈیڑھ لاکھ وصول کیا کرتے تھے مگر خاں صاحب سے انہوں نے ایک پائی بھی نہ لی۔